اقبال کا پاکستان

اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی

شرح منتخب نصاب

سید زید زمان حامد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام تصنیف	:	**اقبال کا پاکستان**
مصنف	:	سید زید زمان حامد
ناشر	:	براس ٹیکس، راولپنڈی
تقلیبِ حروف	:	براس ٹیکس ٹیم
مجلس ادارت	:	سمیع اللہ بخاری، فاطمہ حسین، رملہ کلیم
کتابت و آرائش	:	وقار صدیقی
تاریخ اشاعت	:	اکتوبر ۲۰۱۶ء
قیمت	:	۱۵۰۰ روپے

BRASSTACKS Publications

راولپنڈی، پاکستان

www.zaidhamid.pk

syedzaidzamanhamid@gmail.com

نوٹ: اس کتاب کو مصنف کی اجازت سے امت مسلمہ کی فلاح کیلئے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

سیدی و مرشدی رسول اللہ ﷺ

کی خدمت اقدس میں

ہدیہ عشق و ادب

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

فہرست

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

اسرار خودی

رموزِ بیخودی

سوالات وجوابات

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسماں و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ساری خدائی

من عرفه نفسه فقد عرفه ربه

(جس نے اپنے آپ کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا)

حقیقت تو یہ ہے کہ اسی ایک نقطے میں کائنات کے تمام راز پوشیدہ ہیں۔ خود آگہی ہی دراصل خدا آگہی ہے:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائیؐ
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی!

اس کتاب میں ہم آپ کو ایک غیر معمولی سفر پر لے کر چلیں گے۔ ایک ایسا سفر کہ جو خودی سے خدا تک، اور زمین سے عرش تک کا سفر ہوگا، کہ جس میں زمین، آسماں، کرسی و عرش نشان منزل ہونگے، اس عظیم مقام کے کہ جس کے پار جبرئیل امینؑ کے بھی پر جلتے ہیں۔ اس سفر میں ہمارے مرشد و رہنما ایک ایسے مرد قلندر اور صاحب بصیرت پر اسرار وجود ہونگے کہ جن کی نگاہ وسعت افلاک پر تھی، اور جو کچھ اس نگاہ بلند نے دیکھا، اُس کو اس درویش وقت نے اپنے سخن دلنواز کے ذریعے ایک پرسوز انداز میں، آنے والی نسلوں کیلئے لکھ ڈالا۔ یہ قلندر وقت، صاحب بصیرت وجود حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ ہیں۔ خود شناسی کے اسرار و رموز کا یہ روحانی سفر ہم اقبالؒ کے ساتھ ان کے شہرۂ آفاق کلام ''اسرا خودی'' اور ''رموز بیخودی'' کی روشنی میں طے کریں گے، ان شاء اللہ! اس حیرت انگیز سفر کیلئے جس زادراہ کی ضرورت ہے، وہ چیتے کا جگر اور شاہین کا تجسس ہے کہ یہ نصیب نہ تو زاغوں کا ہے اور نہ ہی کرگسوں کا!!

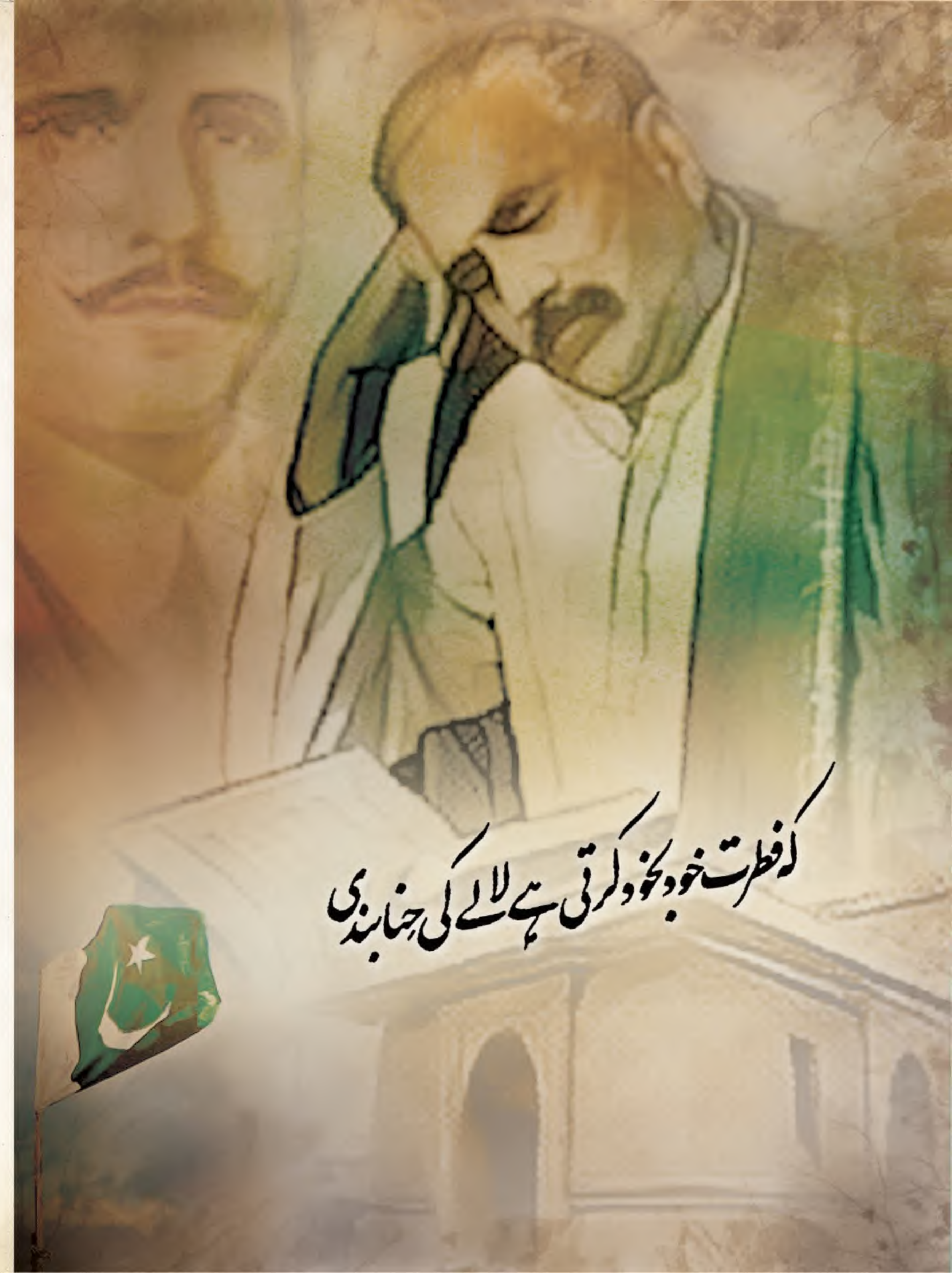

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملاء و جمادات و نباتات

....

آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، وہ دور بہترین بھی ہے اور بدترین بھی، خوش نصیب ترین بھی ہے اور بد بخت ترین بھی، تاریک ترین بھی ہے اور روشن ترین بھی......ہم رات کے اس آخری پہر میں سے گزر رہے ہیں کہ جس کے بعد فجر طلوع ہوتی ہے۔ امت مسلمہ جس کڑے دور سے پچھلے دو ڈھائی سو سال سے گزر رہی ہے، اس کی مثال مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے لیکر خلافت عثمانیہ کے خاتمے تک، اور پھر اکیسویں صدی میں پوری امت مسلمہ پر مسلط ایک نئی صلیبی جنگ کہ جس نے ہلاکو و چنگیز کی خونریزی کو شرما دیا ہے، ایک ایسی تاریک رات کی مانند ہے کہ جس میں کلیجے حلق کو آتے ہیں، مومنین زلزلے کی طرح ہلائے جاتے ہیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ "متیٰ نصر اللہ"......؟

آج امت مسلمہ میں کوئی مسلمان ریاست ایسی نہیں بچی کہ جو یا تو تباہ نہ کر دی گئی ہو یا پھر بری طرح سے کفار کے نرغے میں نہ گھری ہو۔ پوری امت مسلمہ میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان لٹے پٹے یا تو ہجرت پر مجبور ہیں، یا بے رحمی سے قتل کیے جا رہے ہیں، یا ان کی جان و مال و حرمت کو سفاکی سے پامال کیا جا رہا ہے۔ قحط الرجال کا ایسا دور ہے کہ دور دور تک نہ تو کوئی صلاح الدین ایوبیؒ نظر آتا ہے اور نہ ہی کوئی احمد بن حنبلؒ۔ مسلمان امت خلافت کی چھتری سے محروم ہو کر ایک یتیم گھرانے کی طرح سفاک دشمنوں کے رحم و کرم پر

ہے، کہ جس پر چاروں طرف سے بیک وقت صیہونی، مشرک، خوارج اور ملحد اس طرح حملہ آور ہو رہے ہیں کہ جیسے بھوکے دسترخوان پر ٹوٹتے ہیں۔ امت مسلمہ کی تمام سیاسی قیادت فاسق و فاجر ہے، الہ ماشاءاللہ۔ اور امت کا حال یہ ہے کہ "حب الدنیا" میں لتھڑی ہوئی اور "کراہیت الموت" کے مرض میں گرفتار، انتہائی بے بسی سے اپنی تباہی کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ علمائے سُو اس طرح امت میں فساد مچا رہے ہیں کہ الاامان الحفیظ! فتنے انہی علماء میں سے اٹھ کر انہی میں داخل ہو رہے ہیں اور آج زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے بدترین مخلوق یہی علماءِ سُو ہیں کہ جن کے بارے میں سیدی رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پہلے ہی آگاہ فرما دیا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز پر خلافت کی تباہی کے بعد امت رسول ﷺ پر جو کڑا وقت پڑا تھا، اس پر الطاف حسین حالیؒ کا یہ مرثیہ امت مرحوم کی بے بسی کی ایک دردناک تصویر ہے:

اے خاصہ ء خاصان رسل، وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جتنا تاریک دور ہو، اس میں اتنے ہی خوش نصیب وجود پیدا ہوتے ہیں۔ عربوں کے زمانہ جاہلیت میں رسول اللہ ﷺ کی پکار پر لبیک کہنے والے خوش نصیب ترین تھے۔ صلیبی جنگوں کے دوران کہ جب امت مسلمہ روندی چلی جا رہی تھی تو اس وقت صلاح الدین ایوبیؒ اور ان کی جماعت خوش نصیب ترین تھی۔ جب اکبر بادشاہ کے ظلم، کفر اور فسق کے بادل چھانے لگے تو اس دور میں حضرت مجدد الف ثانیؒ خوش نصیب ترین تھے۔ جب سات سمندر پار سے آئے انگریز ہندوستان پر قبضے کی سازشیں کر رہے تھے، تو اس وقت ٹیپو سلطان خوش نصیب ترین تھے۔ امت کو جتنی بڑی آزمائش کا سامنا ہوتا ہے، اس نازک

دور میں چٹان کی طرح کھڑے ہوکر امت رسول ﷺ کا دفاع کرنا اتنی ہی بڑی خوش نصیبی ہے۔ تاریخ کی یہی اندھیری راتیں ان شیروں اور دلیروں کو پیدا کرتی ہیں کہ جن کی اذانوں سے لرزتا ہے شبستان وجود! وہ اللہ کے دست و بازو ہوتے ہیں، اس کی تقدیر ہوتے ہیں، اس کے راز دار ہوتے ہیں، خدا ان سے پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے، ان کی نگاہوں سے تقدیریں بدلتی ہیں، وہ سیدی رسول اللہ ﷺ سے وفا کرنے والے ہوتے ہیں، کہ پھر مالک ان کو لوح و قلم عطا کرتا ہے۔ یہ غلامی کے دور میں مرد آزاد ہوتے ہیں، عشق الٰہی اور عشق رسول ﷺ میں دامن چاک، ایسے صاحب جنوں، مرد بے باک کہ جو پابند تقدیر نہیں بلکہ خود تقدیر یزداں ہوتے ہیں۔

بابا اقبالؒ بھی ایسے ہی خوش نصیب وجود ہیں کہ جو امت کے ایک بدنصیب دور میں اللہ کی طرف سے تحفے کے طور پر بھیجے گئے۔ یہ وہ موذن ہیں کہ جنھوں نے شب تاریک میں وہ اذان دی کہ جس نے شبستان وجود کو لرزا کے رکھ دیا۔ ایسا صور پھونکا کہ ایک مردہ قوم قبروں سے اٹھ کر وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل دینے لگی۔ اقبالؒ اپنے دور کے ایسے وجود تھے کہ جو صدیوں تک امت مسلمہ کی راہنمائی اور قیادت فرماتے رہیں گے۔ یہ بندۂ فقیر ایک ''زندہ رود'' ہے، کہ جس کا فیض ایک تیز بہتے چشمے کی مانند، ماضی میں بھی جاری تھا، آج بھی جاری ہے اور آنے والے وقتوں میں بھی پوری قوت کے ساتھ جاری و ساری رہے گا۔ یہی فیض ایک مردہ قوم میں دل مرتضیٰ اور سوز صدیق پیدا کرے گا۔

....

آج امت مسلمہ جس پستی و ذلت کا شکار ہے اس کا علاج نہ معاشی ترقی ہے، نہ عسکری، نہ تکنیکی تعلیم ہے، نہ علوم و فنون۔ امت کی اصل بیماری روحانی ہے، کہ جس کا علاج کیے بغیر نہ تو یہ اپنے ضمیر میں ڈوب سکتی ہے اور نہ ہی اسے سراغ زندگی ملے گا۔ زمین و آسماں و کرسی و عرش کی تمام سلطنت انسان کی خودی کی زد میں ہے۔ اس خودی کے اسرار و رموز جانے بغیر مادی اور معاشی ترقی انسان کو وہیں پہنچائے گی کہ جہاں آج مغرب کی اخلاق باختہ اور انسان سوز تہذیب پہنچی ہے، کہ جس کے بارے میں اقبالؒ بابا بہت پہلے فرما چکے تھے کہ:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اسی لیے آج کے دور میں اقبالؒ ایک مرد بحران کی حیثیت سے امت کیلئے روشنی کا ایک عظیم مینار ہیں۔ پوری امت مسلمہ میں اس پائے کا کوئی درویش، صاحب نظر، صاحب بصیرت، صاحب فقر و جود نہ ماضی قریب میں تھا، نہ آج ہے، کہ جو عہد حاضر کے تمام فتنوں کو اس شرح صدر کے ساتھ جانتا ہو اور ان کا حل تجویز کرتا ہو کہ جیسے اللہ نے بابا اقبالؒ کو عطا فرمایا ہے۔ وہ قوم انتہائی بدنصیب ہوگی کہ جو اس چشمے سے سیراب ہونے سے محروم رہ جائے۔ امت کے عروج کا سفر اسی خیر سے جاری ہوتا ہے کہ جو اللہ نے اس مرد درویش کو عطا کی ہے۔

جیسا کہ ہمیں اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کسی انسان کی عظمت کا اندازہ کرنا ہو تو یہ دیکھیں کہ تاریک ترین دور میں وہ کس کردار اور جرأت کا مظاہرہ کرتا ہے، اپنی مایوس قوم کو کس طرح حوصلہ دے کر، امید دلا کر اور بشارتیں دے کر زندہ کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ ہے کہ فقط چند نفوس پر مشتمل ایک مختصر سی جماعت، کہ جس میں اکثریت غرباء اور غلاموں کی تھی، اور جبکہ نبی کریم ﷺ کی دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں ہی تھی، آپ ﷺ نے اس جماعت کو یہ خوشخبری عطا فرما دی تھی کہ وہ وقت دور نہیں کہ جب روم اور فارس کی سلطنتوں پر مسلمانوں قابض ہو جائیں گے۔ یہ ظاہراً ناممکن نظر آنے والی خوشخبری مومنین کے لیے تقویت اور منافقین کیلئے شک اور وسوسے کا باعث تھی۔ پھر تاریخ نے ان بشارتوں کی صداقت پر گواہی دی۔

یہی صورتحال اقبالؒ کے دور میں بھی تھی۔ اس وقت کہ جب مسلمان پوری دنیا میں غلام بنائے جا رہے تھے اور خود ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آتا تھا، اقبالؒ نے امت کو اس طرح زندہ کر دیا کہ مسلمانوں نے ایک براعظم کو توڑ کر ایک نئی اسلامی سلطنت قائم کر لی۔ جس نے اقبالؒ پر اعتبار کیا وہ سرخرو ہوا، جو اقبالؒ پر شک کرتا رہا وہ خود بھی رسوا ہوا اور اس نے اوروں کو بھی رسوا کیا۔ اقبالؒ کی اصل ڈیوٹی تو اس نسل کیلئے ہے کہ جس نے آج کے دور میں پیدا ہونا ہے۔ تعمیر پاکستان اقبالؒ کی سعی تھی، اب تکمیل پاکستان اقبالؒ کی بشارت ہے۔ آگے آنے والی تقدیر اتنی شاندار ہے کہ یہ شیروں اور دلیروں میں ایک جذبہ مستانہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور دوسری جانب شک اور وسوسے میں غرق منافقین کو ایک بے یقینی کے ہیجان میں مبتلا رکھتی ہے۔ ظاہراً یہ بشارتیں ناممکن نظر آتی ہیں، مگر ہر صاحب بصیرت، صاحب نظر، کہ جو خدا کا راز دار ہے، ان کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نُطق اعرابی

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

نکل کر صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے قدسیوں سے میں نے، وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

....

اس سے پہلے کہ ہم کلام اقبالؒ کی طرف جائیں تھوڑا اسا دور اقبالؒ پر بھی نگاہ ڈالتے ہیں۔

ہندوستان کی جو صورتحال اس دور میں تھی، وہ مولانا الطاف حسین حالی کے ان الفاظ سے بالکل واضح ہو جاتی ہے:

"The Muslims nation is devastated. Those who were in power are now living in disgrace. Those who were leading an honorable life are in dust. Knowledge has vanquished and religion is there only in name. Everyone is crippled by the customs and rituals; ignorance and blind following is paramount. The prosperous class that could help the nation is in oblivion. The Ulema who can play a greater in reforming the nation are ignorant of the needs and welfare of the nation.

ترجمہ: ''مسلمان تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ ان میں سے جو اقتدار اور اختیار رکھتے تھے رسوا ہو چکے۔ جو ایک باعزت زندگی گزار رہے تھے وہ اب ذلیل و خوار ہیں۔ علم اٹھ چکا ہے۔ مذہب صرف نام کو باقی رہ گیا ہے۔ لوگ رسوم و رواج کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جہالت اور اندھی تقلید طول و عرض میں پھیل چکی ہے۔ امراء کہ جن سے امیدیں وابستیں تھیں، حالات کے ادراک سے قاصر ہیں۔ علماء کہ جو مذہب کے احیاء اور تجدید کے معاملے میں کوئی کردار ادا کر سکتے تھے، قوم کی ضروریات اور فلاح سے قطعاً بیگانہ ہیں۔''

حالی نے اپنی مسدس میں بھی اس صورتحال پر آنسو بہاتے ہوئے نہایت ہی دلگداز شعر کہے ہیں:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے

....

سر سید احمد خان

پستی کے اس دور میں مسلم دنیا میں دو بڑی تحاریک بھی شروع ہوتی ہیں۔ ایک تحریک ''اعتدال پسندوں'' کی تھی کہ جو یہ سمجھتے تھے کہ حالات اب بہت خراب ہو چکے ہیں، لہذا اب تصادم اور انقلاب کا راستہ ترک کر کے ہمیں انگریزوں کے ساتھ مصالحت سے چلنا چاہیے، مثلاً سر سید احمد خان و دیگر ہم خیال۔ دوسری جانب جمال الدین افغانی کی تحریک تھی کہ جس کا مقصد خلافت عثمانیہ کے تحت مسلمانوں کو متحد کر کے انگریز استعمار کے خلاف بغاوتیں برپا کر کے امت کو دوبارہ عروج کی جانب لے کر جانا تھا۔ مگر حقیقت اور وقت کا دھارا ان دونوں تحاریک کے خلاف تھا۔ گو کہ سر سید نے مسلمانوں کی تعلیم پر کچھ کام کیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی خطرات میں گھری مسلمان امت کو ذلت و پستی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالنے کا کوئی بھی پائیدار حل نہ دے سکے۔ دوسری جانب جمال الدین افغانی کی تحریک بھی اپنی موت آپ مرگئی کہ جب خلافت عثمانیہ اپنے ہی بوجھ تلے دب کر دم توڑ گئی۔

جمال الدین افغانی

ان دونوں تحاریک کے متوازی ایک تیسری اور منفرد سوچ بھی پیدا ہوئی کہ جس کی بنیاد اقبالؒ نے رکھی۔ اقبالؒ نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے، حقیقت پسندی کی بنیاد پر، نظریاتی اور روحانی بنیادوں کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا ایک ایسا رومانوی تصور دیا کہ جو اس سے قبل امت مسلمہ کی تاریخ میں کسی صاحب نظر نے پیش نہیں کیا تھا۔ اقبالؒ کے مطابق جب تک مسلمان اپنی اصل حقیقت یعنی ''حقیقت انسانیہ'' کو نہیں پہچانیں گے، اس وقت تک کوئی بھی تدبیر، سیاست یا سائنسی ترقی مسلمانوں کی تقدیر تبدیل نہیں کر سکتی۔ اقبالؒ نے اسی روحانی نظریے کو ''فلسفہء خودی'' کا نام دیا کہ جس سے امت مسلمہ اس سے پہلے نا آشنا تھی۔ یہ معرفت اور حقیقت کی معراج کے ساتھ جدید دنیاوی تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہوا ایک ایسا انقلابی نظریہ تھا کہ جس کی بنیاد پر ''جنیدی'' اور ''اردشیری'' نے یکجا ہو کر امت مسلمہ کا احیاء کرنا تھا۔ یہ ایک ایسا حیرت انگیز تصورِ حیات تھا کہ جس کی زد میں ساری خدائی تھی۔ اس سے زیادہ مسحور کن، انقلابی، روحانی اور جدید نظریہ حیات انسانی تاریخ میں اس سے قبل کبھی نہیں پیش کیا گیا۔ اسی لیے اقبالؒ کو ''مردِ استقبال'' بھی کہتے ہیں کہ جو آنے والے دور کو بھی اپنی مٹھی میں مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔

....

بیسویں صدی کے اوائل میں اقبالؒ ابھی محض ایک نوجوان تھے اور ان کی شاعری ابھی اپنے ابتدائی دور میں ہی تھی، یعنی ابھی اقبال ''اقبال'' سے آگاہ نہیں ہوئے تھے، فطرت ابھی لالے کی حنا بندی کر رہی تھی۔ اللہ نے ان کے کلام میں جو ''سوز و ساز رومی'' اور ''پیچ و تاب رازی'' ڈالا تھا، اس کا اندازہ آپ کو اس پر اثر واقعہ سے بخوبی ہو جائے گا۔ اس دور میں انجمن حمایت اسلام، کہ جو یتیموں اور بیواؤں کی کفالت کرنے والی ایک فلاحی تنظیم تھی، اور جو اکثر چندا اکٹھا کرنے کی غرض سے جلسے منعقد کیا کرتی تھی، نے ایک دفعہ اقبالؒ سے یتیموں کے حوالے سے اپنے جلسے میں کلام پڑھنے کی درخواست کی۔ اقبالؒ نے جب اپنی نظم ''نالہء یتیم'' پڑھنا شروع کی تو مجمع پر رقعت طاری ہوگئی اور جب اقبالؒ نے اپنا کلام ختم کیا تو حال یہ تھا کہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اس کلام میں اقبالؒ ایک یتیم کو دربار رسالت ﷺ میں پیش کرتے ہیں کہ جس کی فریاد کو سن کر آقا ﷺ اقبالؒ کے الفاظ میں فرماتے ہیں:

کانپتا ہے آسماں تیرے دلِ ناشاد سے
ہل گیا عرشِ معظم بھی تری فریاد سے

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

کہہ رہی ہے اہلِ دل سے ابتدا اسلام کی
ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی
تم اگر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے
آبرو میری یتیمی کی تمہارے ہات ہے

اقبالؒ کی اس فریاد نے لوگوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔اس جلسہ گاہ میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگوں نے اقبالؒ کے کلام میں موجود ایک ایک شعر کی قیمتیں لگانا شروع کر دیں اور اس سے حاصل کردہ آمدن یتیموں کی کفالت پر خرچ ہوئی۔آپ یقین نہیں کریں گے کہ ہزاروں کی تعداد میں نظم کی کاپیاں تقسیم ہوئیں اور اس دور کے لحاظ سے لاکھوں کا چندہ اکٹھا ہوا۔ابھی قدرت کی طرف سے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس نادر وجود کا تعارف کروایا جا رہا تھا کہ جس نے آگے جا کر امت کے احیاء کیلئے اس دور میں موذن رسول ﷺ کا کردار ادا کرنا تھا۔

....

اگر ہم اقبالؒ کے فکری ارتقاء کا جائزہ لیں تو ہمیں وہ اپنی نوجوانی کے دور ہی سے ایک علمی عبقری (genius) کے طور پر نظر آتے ہیں کہ جو مادی علوم میں بھی اتنی ہی مہارت رکھتے تھے کہ جتنی روحانی اور مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) میں۔اقبالؒ کے علوم اس قدر حیرت انگیز تضادات کا مجموعہ تھے کہ جس کی مثال نہ تو شرق و غرب میں کہیں ملتی ہے اور نہ ہی ان کے بعد آج تک کوئی ان کا ثانی پیدا ہو سکا ہے۔فطرت کی طرف سے اقبالؒ کو عطا کردہ کمال اس قدر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا تھا کہ ان کے ہم عصر دانشور بھی بے ساختہ ان کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی اقبالؒ کے حقیقی علمی اور روحانی مقام کی گرد بھی نہ پا سکا۔

مشہور نوبل انعام یافتہ جرمن ناول نگار و شاعر ہرمن ہیس (Herman Hesse 1877-1962) نے اقبالؒ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

> “
> Iqbal belongs to three domains of the spirit and intellect, the source of his tremendous work: the worlds of India, of Islam, and of Western thought. There are, to my knowledge, few writers or poets, whether in the East or in the West, who have been as much at home in the philosophies of both these vast domains, or who have written with such eloquence in Urdu, Persian and English. (He also had full command of Arabic and Punjab, and knew some German.)

''اقبالؒ کے شاندار روحانی و فکری کام کو ہم تین دائروں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ہندوستان کا میدان عمل، اسلام، اور مغربی فکر و فلسفہ۔کم ہی لکھاری و شعراء ہونگے، خواہ مغرب کے ہوں یا مشرق کے، کہ جو دونوں تہذیبوں کے فلسفے پر اتنا عبور رکھتے ہونگے اور انہوں نے اردو، فارسی اور انگریزی میں اس کمال فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھا ہوگا۔(اقبالؒ عربی اور پنجابی پر مکمل ملکہ رکھتے تھے اور ایک حد تک جرمن زبان بھی جانتے تھے۔)

اقبالؒ کے علم اور روحانی مقام کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ جب وہ نوجوانی میں بطور ایک فلسفی اور مفکر ابھر رہے تھے تو اسی دور میں آپ نے چار کتابیں بھی لکھ ڈالیں۔ان میں سے ایک حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے شاگرد عبدالکریم الجیلی کی معرکۃ الآراء کتاب ''الانسان الکامل'' پر مختصر شرح تھی۔الجیلی کی یہ کتاب اسلامی تصوف میں کسی بھی انسان کو حاصل ہونے والے بلند ترین روحانی مقام پر فائز وجود کی خصوصیات پر ہے۔یہ کتاب معرفت اور حقیقت کی معراج کے اتنے دقیق اور نازک معاملات پر بحث کرتی ہے کہ ہر دور میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا وجود ہو سکتا ہے کہ جو اس عظیم کتاب کی روح کو سمجھ سکے۔جس بحر معرفت کے کنارے بڑے بڑے علماء، صوفیاء اور ابدالوں نے خاموشی اختیار کی، اقبالؒ جوانی میں ہی اس بحر بیکراں سے سیراب ہو چکے تھے۔آنے والے دور میں جب اقبالؒ نے معرفت اور حقیقت کی معراج کو اپنے کلام میں بیان کرنا شروع کیا تو ہمیں اس میں واضح طور پر حضرت محی الدین ابن عربیؒ اور شیخ عبدالکریم الجیلی کا فیض بھی نظر آتا ہے۔

اسی دور میں اقبالؒ نے ایک دوسری کتاب برطانیہ کی سیاسی تاریخ پر لکھی کہ جس کا مقصد مغربی تہذیب کے پس منظر کو امت مسلمہ کے سامنے پیش کرنا تھا۔اقبالؒ کی تیسری کتاب سیاسی معاشیات پر تھی کہ جس میں انہوں نے اس دور کی سیاسی معاشیات، بشمول سرمایہ داری نظام و اشتراکیت، کی حقیقت کو واضح کیا۔چوتھی کتاب اقبالؒ نے اقتصادیات پر لکھی کہ جس کا عنوان ''علم الاقتصاد'' تھا۔اس کتاب میں علامہؒ نے کرنسی کا تصور، اس کا اتار چڑھاؤ، روپے کی گردش، اشیاء کی قیمت کے تعین کے اصول وغیرہ کو واضح کیا، کہ جو معاشیات کی بنیادیں ہیں۔بیس بائیس کی عمر میں قدرت کی طرف سے اقبالؒ کو ان علوم سے لیس کیا جا رہا تھا کہ جو آنے والے دور میں اقبالؒ کا وہ ہتھیار بننا تھے کہ جن سے انہوں نے زمانے کے طاغوتوں کے خلاف ضرب کلیم لگانی تھی۔امت رسول ﷺ کے ابھرتے ہوئے اس ستارے کو نوجوانی میں ہی جہاد زندگانی کی شمشیروں سے مسلح کر دیا گیا تھا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبالؒ کو بھی حضرت ابراہیمؑ ہی کی طرح ایک فکری ارتقاء کے عمل سے گزارا گیا۔جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اول اول ستارے، پھر چاند اور پھر سورج کو اپنا خدا جانا تھا کہ جس کے ڈوبنے کے بعد انہوں نے کہا کہ ''میں ڈوبنے والوں کو نہیں چاہتا''۔اسی طرح اقبالؒ نے بھی شروع شروع میں ہندوستانی قومیت پرستی کی جانب نگاہ کی۔اسی دور میں انہوں نے وہ مشہور ترانہ ہندی لکھا

:''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''۔ آج بھی یہ نظم ہندوستان میں ایک قومی ترانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اقبالؒ کے فکری ارتقاء کا یہ دور مختصر ہی تھا اور جلد ہی آپ کی توجہ امت مسلمہ کی جانب مبذول ہوگئی۔ 1905ء تک کہ جس سال اقبالؒ یورپ کے لیے روانہ ہوئے، اقبالؒ ''پین اسلامک'' یعنی اتحاد بین المسلمین کے داعی ہو چکے تھے، اور اس کے بعد آپ نے ''چین وعرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' لکھا۔ یعنی آپ کی فکر ہندوستان کی حدود سے نکل کر آفاقی ہو چکی تھی۔ یہ اقبالؒ کے سیاسی فکری ارتقاء کی محض ایک جھلک ہے۔

....

یورپ میں گزرا وقت ہی وہ ''طوفان مغرب'' تھا کہ جس نے اقبالؒ کو ''مسلماں'' کر دیا۔ اسی ''عذاب دانش حاضر'' سے گزرنے کے بعد وہ ''خلیل'' بنتے ہیں۔ اب اقبالؒ براہ راست اس مغربی تہذیب کے قلب میں موجود تھے کہ جس کا ''چہرہ روشن'' اور ''اندروں چنگیز سے تاریک تر'' تھا۔ اقبالؒ کے فکر و قلب کی مستی کی چنگاری کو بھڑکا کر آتش فشاں بنانے کا تمام سامان فطرت نے مغرب میں میسر کر رکھا تھا۔ خودکشی کرتی مغربی تہذیب، اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک دمک، مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی دردانگیز یادگاریں، ابلیس کی مجلس شوریٰ کے عملی مظاہر، اپنوں کی سادگی اور اوروں کی عیاری، سبھی کچھ فطرت نے اقبالؒ کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

فطرت نے اقبالؒ کو ویسے ہی ایک حساس وجود بنایا تھا۔ یورپ کی جانب یہ علمی سفر صرف حصول علم تک ہی محدود نہ رہا، بلکہ ''کلیمی'' تک جا پہنچا۔ یورپ کے سفر کے دوران جب اقبالؒ کا بحری جہاز حجاز کے ساحلوں کے پاس سے گزرتا ہے، تو آپکے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور فراق رسول ﷺ میں بے اختیار یہ الفاظ آپ کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں:

''اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو! تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے پر تجھ پر کیا فسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو! کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام مسلمانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا، اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذان بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔''

....

پروفیسر نکلسن

پروفیسر آرنلڈ

کیمبرج پہنچنے کے بعد آپ ''لنکنز ان'' میں وکالت کی تعلیم کیلئے داخلہ لیتے ہیں، اور دوسری طرف جرمنی میں میونخ یونیورسٹی میں بھی فلسفے میں ڈاکٹریٹ کیلئے درخواست بھیجتے ہیں۔ اس نوجوانی کے اقبالؒ میں ہی آثار ولایت نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے اور یہ دیکھا جا سکتا تھا کہ ایک بہت بڑا فقیر بننے کے عمل میں ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اقبالؒ بیٹھے بیٹھے جذب کے عالم میں چلے جاتے۔ اقبالؒ خود کہتے ہیں کہ حافظ کا کلام سناتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حافظ میرے وجود میں حلول کر جاتے ہیں اور پھر وہ خود ہی اپنا کلام پڑھتے ہیں۔

فلسفے میں اقبالؒ کی تربیت میں ان کے استاد پروفیسر آرنلڈ کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا کہ جو ہندوستان میں بھی اقبالؒ کے استاد رہے تھے۔ جب اقبالؒ برطانیہ گئے تو وہاں بھی ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا رہا۔ پروفیسر آرنلڈ جو کہ خود بھی ایک نیک دل عیسائی محقق تھے، کا اقبالؒ کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق سے محقق ترین بنا دیتا ہے، اور خوش نصیب ہے وہ استاد کہ جس کو اقبالؒ جیسا شاگرد ملے۔ اس کے علاوہ پروفیسر نکلسن کہ جو خود بہت بڑے مشرقی علوم کے ماہر اور مستشرق تھے، اقبالؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔ نکلسن نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کا انگریزی ترجمہ بھی کیا تھا۔ آنے والے دور میں کہ جب اقبالؒ نے اسرار خودی تحریر کی تو اس کا انگریزی ترجمہ بھی نکلسن نے ہی کیا۔

فطرت اقبالؒ کی شخصیت کی صورت گری کے سلسلے میں خود ہی ساز باز کر رہی تھی۔ برطانیہ اور جرمنی سے علوم حاصل کرنا اسی بڑے روحانی منصوبے کا حصہ تھا۔ جرمنوں نے مشرقی فلسفے پر بہت کام کیا ہے اور اقبالؒ نے اس سے پورا استفادہ کیا۔ مولانا رومؒ، شیخ سعدیؒ، حافظؒ اور خصوصاً نبی ﷺ کی سیرت اور اسلام سے جرمن مستشرقین بہت متاثر ہیں۔ اس حوالے سے گوئٹے کا نام سر فہرست ہے۔ اس وقت تک اقبالؒ نے فارسی میں شاعری کا آغاز نہیں کیا تھا اور ان کا تمام تر کلام اردو میں ہی تھا۔ اس دور میں اقبالؒ پر ایک ایسی قلبی واردات بھی آئی کہ جب انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اب شاعری نہیں کریں گے اور تمام تر وقت فلسفے کیلئے وقف کر دیں گے۔ یہاں پھر ان کے استاد پروفیسر آرنلڈ کی بصیرت اور انکا اقبالؒ سے تعلق تائید ایزدی بن کر ظاہر ہوا اور انہوں نے اقبالؒ کو شاعری ترک کرنے سے روک دیا۔ اسی دور میں اقبالؒ نے اپنا جوڈاکٹریٹ کا مقالہ تحریر کیا وہ بھی ایرانی فلسفہء مابعد الطبیعات پر تھا، کہ جس کا عنوان تھا ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' The Development of Metaphysics in Persia۔ جرمنوں کے فارسی شعرا پر کام اور پھر فارسی مابعد طبیعات پر تحقیق نے اقبالؒ کو فارسی میں شعر گوئی کی جانب راغب کیا۔ اقبالؒ کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے اندر جو افکار اور جذبات کا متلاطم سمندر رکھتے ہیں، اس کی ادائیگی اور اظہار کیلئے فارسی ہی موزوں ترین زبان ہے۔ اور دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ فارسی کا اثر و رسوخ مسلم دنیا، خصوصاً ہندوستان کی اشرافیہ، پر بہت زیادہ تھا۔ پھر آنے والے دور میں اقبالؒ نے جو معرکۃ الآراء کلام لکھا اسکا ایک بڑا حصہ فارسی ہی میں تھا۔

اقبالؒ جب مغرب کی جانب عازم سفر ہوتے ہیں تو اپنے وجود میں چنگاریاں لے کر جاتے ہیں اور جب لوٹتے ہیں تو بھڑکتا ہوا آتش فشاں ساتھ لاتے ہیں۔

میں ظلمتِ شب میں لے کر نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفَس مرا شعلہ بار ہوگا

مغرب میں رہتے ہوئے آپ نے پورے مغربی اور مشرقی فلسفے کو چھان ڈالا۔ مزید یہ کہ فارسی شاعری میں عرفان وتصوف کی تمام وادیوں سے گزرنے کے بعد اب آپ اس مقام پر فائز تھے کہ مشرق اور مغرب کے فلسفوں کا تقابلی موازنہ کر کے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنا فلسفہ ونظریہ پیش کر سکتے۔ آنے والے دور میں خود جرمن اقبالؒ کے کمال کے اس قدر معترف ہوئے کہ جس مکان میں اقبالؒ نے قیام کیا اور جس درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ پڑھا کرتے تھے، اس کو جرمنی نے قومی ورثے کی حیثیت سے محفوظ کر دیا۔ ہائیڈل برگ میں ایک سڑک بھی اقبالؒ کے نام سے منسوب ہے۔

اقبالؒ کے یورپ میں گزارے گئے وقت کو ہم تین جہتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، جن میں سے ایک ان کی طالب علمانہ حیثیت تھی۔ زمانہ طالب علمی کسی بھی شخص کیلئے زندگی کا ایک انتہائی سنہرا دور ہوتا ہے۔ اقبالؒ بھی اپنی آخری سانس تک یورپ میں گزارے ان لمحات سے اپنے آپ کو منقطع نہیں کر سکے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب اقبالؒ کو روحانی اور علمی دونوں اعتبار سے غذا وافر مقدار میں میسر آ رہی تھی اور ان کے گرد و پیش میں ایسا ماحول اور اکابرین موجود تھے کہ جو مسلسل ان کی شخصیت کی ساخت گری میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ عطیہ فیضی اور

ورلڈ وار ٹو کی ایک مصوری کہ جو اس ظلم و جبر کی داستاں بیاں کرتی ہے

یورپی تہذیب کی توجہ انسان کی نفسانی خواہشات کی تکمیل پر ہی مرکوز تھی اور ظاہر میں آب حیات نظر آنے والی یہ تہذیب حقیقت میں بحر مردار تھی۔ اپنی تمام تر مشینی ترقی کے باوجود یورپ بے سکون تھا۔ قلب و نگاہ کی موت واقع ہو چکی تھی، آوارگی و اخلاق باختگی کا سرطان پورے معاشرے کے ذہنی و روحانی سکون کی جڑیں کاٹ چکا تھا۔ سکون کی تلاش میں سرگرداں مغربی انسان ہر فکر اور فلسفے کی وادی میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ نہ کوئی مقصد حیات تھا نہ کوئی مرشد کامل۔ انسانیت کی مکمل تباہی کے تمام اسباب میسر تھے۔ اقبالؒ کی واپسی کے بعد آنے والے دور میں اسی یورپ میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے نام پر وہ حشر عظیم برپا ہوا کہ الامان والحفیظ!! کروڑوں انسان کیڑوں کی مانند اپنوں ہی کے ہاتھوں مسلے گئے۔ اپنے قیام کے دوران ہی اقبالؒ کو جمہوریت کی نیلم پری کے روپ میں ظلم و استبداد کا یہ دیو پاؤں مارتا، چلا آتا نظر آ رہا تھا۔

تیسرا پہلو اقبالؒ کے ذاتی علمی ارتقاء اور روحانی بالیدگی کا تھا کہ جہاں وہ ایک ہندی قوم پرست سے بلند ہو کر ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے'' کی منزل تک جا پہنچے تھے۔

اپنی شخصیت کے ارتقاء کے تمام پہلو اقبالؒ کی زندگی میں متوازی چل رہے تھے۔ پھر 1908ء میں کہ جب ان کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے اور وہ واپسی کا سفر اختیار کرتے ہیں تو ان کی شخصیت کے یہ تینوں پہلو انتہائی نمایاں اور پختہ ہو کر ان کے ساتھ واپس لوٹتے ہیں۔ جرمنی

عطیہ فیضی کی ایک یادگار تصویر

ایما ویگناست جیسے وفادار اور علمی دوستوں کی سنگت نے بھی اقبالؒ کی شخصیت میں رنگ بھر دیئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اقبالؒ یورپی تہذیب کا بھی گہرا مشاہدہ کر رہے تھے۔ اور امت کے لٹتے ہوئے قافلے پر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

میر سپاہ نا سزا لشکریاں شکستہ صف
آہ !وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

یورپ سے واپسی کے سفر میں اقبالؒ کا بحری جہاز اٹلی کے ایک جزیرے سسلی کے پاس سے گزرا۔ سسلی کہ جو ماضی میں ''صقلیہ'' کہلاتا تھا، مسلم ریاست کا حصہ رہ چکا تھا۔ بحیرہ روم تو ایک دور میں مسلمان جھیل (Muslim Lake) کہلاتا تھا، کیونکہ عثمانی سلطنت کی ان پانیوں پر حکومت تھی۔ اقبالؒ جب سسلی کے پاس سے گزرے تو ان کا بے تاب دل عظمت رفتہ یاد کر کے بے اختیار رو پڑا۔ اسی غم کے عالم میں انہوں نے ایک نہایت ہی دردانگیز نظم کہی کہ جو اس اقبالؒ کا تعارف کرواتی ہے کہ جو اب یورپ سے لوٹ رہا ہے۔

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اور وں کو وہاں رلواؤں گا

چھوڑنے پر اقبالؒ بہت افسردہ تھے کہ جس کا اندازہ بعد میں ان کی ایما ویگناست کے ساتھ ہونے والی خط و کتابت سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ عطیہ فیضی کے ساتھ ان کی علمی اور روحانی مطابقت اتنی تھی کہ اقبالؒ ان کو اپنی شریک حیات بنانا چاہتے تھے، لیکن دونوں کے پس منظر میں بہت فرق تھا۔ عطیہ فیضی کا تعلق ایک بہت امیر گھرانے سے تھا، جبکہ اقبالؒ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے۔ عطیہ فیضی ایک بہت آزاد خیال خاتون تھیں، جبکہ اقبالؒ اپنی مشرقی روایات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ یورپ سے واپسی پر اقبالؒ کے سامنے جو مشن تھا، اس کے تناظر میں اقبالؒ کی زندگی میں عطیہ فیضی کی کہیں بھی جگہ نہیں بن رہی تھی۔ لہذا اقبالؒ نے سوچا کہ عطیہ فیضی ایک مشیر، ایک رازدار علمی دوست کی حیثیت سے تو ان کے ساتھ چل سکتی ہیں، مگر ایک شریک حیات کی حیثیت میں نہیں۔

ایما وایگناست

دوسری جانب جرمن خاتون ایما وایگناست تھیں جو کہ اقبالؒ کو بہت پسند کرتی تھیں، لیکن وہ بھی اقبالؒ کی زندگی کے منظر نامے میں جگہ نہ بنا سکیں۔ یہ دونوں جذباتی صدمے اقبالؒ کیلئے شدید تھے۔ اپنے مشن کی راہ میں اپنے جذبات کی قربانیاں یقیناً اقبالؒ جیسا عظیم وجود ہی دے سکتا ہے۔ اقبالؒ تو عطیہ فیضی یا ایما ویگناست میں سے کسی ایک کو اپنی شریک حیات بنا کر یورپ میں ہی بقیہ زندگی عیش وعشرت سے گزار سکتے تھے۔ لیکن اقبالؒ پر یہ بات آشکار ہو چکی تھی کہ قدرت نے پوری کائنات کو ان کی رزم گاہ بنایا ہے اور اب آنے والے دور میں اقبالؒ کا کلام اور ان کا کام ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے جا رہا ہے۔ اپنی ذات اور جذبات کی قربانی اس عظیم مقصد حیات کی راہ میں اقبالؒ کو دینا لازم تھی۔ اب ہندوستان واپسی ناگزیر تھی......

ہے، اور اقبالؒ بھی ان ذمہ داریوں سے مبرا نہ تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد ان کیلئے ایک بہت بڑا مسئلہ ذریعہ معاش کا تھا۔ انہوں نے وکالت کو ہی پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ یورپ سے واپسی کے بعد اگلے دو تین سال کی جدوجہد اقبالؒ کیلئے نہایت جاں گسل ثابت ہوئی۔ کہاں وکالت کے جھنجٹ اور کہاں فکری محاذ کی مشکلات اور شعر وشاعری کی نزاکتیں۔ ان دونوں متضاد جہتوں کو نبھانا ایک جاں توڑ مرحلہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دور اقبالؒ کیلئے ایک عذاب سے کم نہ تھا۔ تیسری جانب اقبالؒ اندرون خانہ بھی ایک بہت بڑے عائلی بحران سے دوچار تھے۔ یورپ جانے سے قبل، نہایت کم عمری میں ہی، ان کی شادی کر دی گئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ شادی چل نہ پائی۔ بعد میں حادثاتی طور پر اقبالؒ کی یکے بعد دیگرے دو شادیاں ہوگئیں۔ گو کہ دونوں خواتین بڑی سمجھدار اور صابر تھیں، لیکن اقبالؒ کو خانگی معاملات کے یہ جھمیلے نمٹاتے نمٹاتے کافی وقت لگ گیا۔ کئی برس بعد انہیں گھریلو محاذ پر ذہنی سکون نصیب ہوا۔ ذاتی زندگی کے اس پر آشوب دور میں اقبالؒ بمشکل دو تین نظمیں ہی لکھ پائے۔ عطیہ فیضی کا بھی ان حالات پر تبصرہ تھا کہ فکرِ معاش اور گھریلو پریشانیوں میں اقبالؒ بجھ سے گئے ہیں۔ یہ دور کہیں جا کر 1911ء کے آس پاس ختم ہوا۔

اس تکلیف دہ دور کے بعد ہم ایک مختلف اقبالؒ کو دیکھتے ہیں۔ یہ دور عالمی سیاست کے اعتبار سے بھی بہت اہم تھا۔ ایک طرف یورپی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کو گھیرے میں لے لیا تھا اور وہ اس پر مختلف اطراف سے حملے کر رہی تھیں۔ جنگ طرابلس بھی شروع ہو چکی تھی کہ جس میں اٹلی نے افریقہ میں لیبیا کے چند علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ترکوں اور عربوں نے مل کر اس علاقے کو آزاد کرنے کیلئے مزاحمت شروع کر دی تھی۔ ہند کے مسلمانوں کی خلافت عثمانیہ کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی تھی، چنانچہ اقبالؒ نے اس دور میں بڑی جذباتی نظمیں لکھیں کہ جن میں سے ایک نظم جنگ طرابلس کے حوالے سے بھی تھی۔ اس نظم میں اقبالؒ، نبی اکرم ﷺ کے حضور میں ایک فریاد لے کر جاتے ہیں۔ یہ نظم اس قدر جذباتی اور دلخراش تھی کہ مجمع دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

حضورﷺ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

پھر جنگ طرابلس کے ہی حوالے سے انہوں نے اپنی وہ مشہور پر اثر نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کہی کہ جس کو سننے کے بعد بادشاہی مسجد میں موجود مجمع جذبات سے بے قابو ہوگیا۔ فاطمہ ایک کم سن بچی تھی جو کہ طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی:

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب، اپنی خاکستر میں تھی!

اسی دور میں اقبالؒ نے فرمایا کہ میں چاہوں تک اپنی شاعری سے اپنی قوم میں آگ لگا دوں، لیکن مجھے احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ میری قوم اس کیلئے تیار نہیں ہے۔

یہ وہ وقت تھا کہ جب پورے برصغیر کے مسلمان انتہائی دکھ اور تکلیف میں تھے، اور عالمی سطح پر امت انتہائی پستی اور ذلت میں گر چکی تھی۔ یہی وہ دور ہے کہ جہاں اقبالؒ اپنا شاہکار، ''شکوہ'' لکھتے ہیں۔1911ء میں اقبالؒ نے شکوہ لکھی۔شکوہ جب اقبالؒ نے ایک محفل میں پڑھی تو اس محفل کا عالم یہ تھا کہ سب زاروقطار رو رہے تھے۔اقبالؒ کے والد بھی اس محفل میں شریک تھے۔ان کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔مسکراہٹ اللہ کے اس فضل پر کہ جوان کے بیٹے پر ظاہر ہو رہا تھا، اور آنسو اس کرب پر کہ جس سے امت رسول ﷺ گزر رہی تھی۔اقبالؒ کے اس ''شکوہ'' پر کئی تنگ نظر ملاؤں نے فتوے بھی لگائے، اور اقبالؒ کو گستاخ بھی قرار دیا۔1913ء میں اقبالؒ نے اپنا دوسرا شاہکار ''جواب شکوہ'' لکھا۔

....

مسلم دنیا اور خصوصاً ہند کی تاریخ اور سماجی حالات مختصراً بیان کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ اس ماحول سے کچھ حد تک آشنا ہو جائیں، کہ جس میں اقبالؒ تشریف لائے، کہ اس پس منظر کے بغیر نہ تو آپ اقبالؒ کو جان سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی بلند اقبالی کو۔اقبالؒ کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے عہد کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔جس کرب سے اس دور میں انسانیت بالعموم اور امت مسلمہ بالخصوص گزر رہی تھی، وہ اس آتش فشاں کی مانند تھا کہ جس کی حدت نے اقبالؒ کے پورے وجود کو پگھلا کر کندن کر دیا۔اس قیامت خیز عہد میں امت مرحوم کی اتنی بے بسی نے اقبالؒ کے پورے وجود کو اس قدر احساس زیاں میں مبتلا کر دیا کہ ان کی تمام تر حسیات لطافت کی آخری حدوں تک بیدار ہو گئیں۔اب اقبالؒ نہ صرف مادی دنیا کی بصارت رکھتے تھے بلکہ ان کی بصیرت باطنی دنیا کے پردوں کو بھی چیر کر ذات الٰہی کی راز دار بن چکی تھی۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر

اقبالؒ کا یہی کمال ان کو ''پراسرار'' بناتا ہے۔اہل نظر نے ان کو ''حکیم الامت'' کا خطاب دیا، مگر اہل بصیرت کے ہاں وہ ''مجدد عصر''، ''کلیم زماں'' اور ''درویش وقت'' کہلائے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی اسرار و رموز سفر مغرب سے لوٹنے کے بعد لکھنا شروع کی۔امت مرحوم کی تباہی اور مغرب کی آوارگی نے اقبالؒ میں شدید اضطراب پیدا کر دیا تھا۔مشرق اور مغرب میں انسانیت تباہی کے دہانے پر تھی۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

مغرب میں گزارے گئے برسوں میں اقبالؒ نے فراست مومن سے اس ناپائیدار تہذیب کا اتنا عمیق مشاہدہ کیا کہ پھر کوئی اور صاحب نظر ان کی گرد کو بھی نہ پا سکا:

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو

مغربی تہذیب کے امراض کی ایسی تشخیص شرق و غرب میں کوئی اور نہ کر سکا۔

It has brought trouble to humanity and growing sorrow. Man in its eyes is but water and clay, and life but random caravan without destination,

ترجمہ: ''اس تہذیب نے انسانیت کیلئے گوناگوں مسائل پیدا کیے ہیں اور اسے غم و اندوہ سے دوچار کر دیا ہے۔انسان اس کی نگاہ میں محض آب و گل ہے، اور زندگی ایک ایسا جہاز کہ جس کی کوئی سمت نہیں۔''

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگِ مفاجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

یہ وہ دور تھا کہ جب خود مسلمانوں میں بھی احساس کمتری و ذلت اس مقام پر پہنچ چکا تھا کہ امت اپنی نجات فقط ناپاک مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں ہی سمجھتی تھی۔ تمام تر افکار و نظریات کہ جو اس وقت پوری امت مرحوم میں پنپ رہے تھے، مغرب ہی سے درآمد کیے گئے تھے۔ جہاں اقبالؒ نے تہذیب مغرب کے مرض کی تشخیص کی، وہاں ان کا اصل مخاطب امت مرحوم ہی تھی۔ مسلمانوں کو مغرب کی مرعوبیت اور طوق غلامی سے نکال کر ملت احمد مرسل ﷺ میں دوبارہ داخل کرنا ہی ان کا اصل ہدف تھا۔

کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو
ملت احمدؐ مرسل کو مقامی کر لو

احساس کمتری میں ڈوبی ہوئی ملت کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

شرق را از خود برد تقلید غرب
باید این اقوام را تنقید غرب
قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نی ز رقص دختران بی حجاب
نی ز سحر ساحران لالہ روست
نی ز عریان ساق و نی از قطع موست
محکمی او را نہ از لادینی است
نی فروغش از خط لاتینی است
قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمین آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست
علم و فن را ای جوان شوخ و شنگ
مغز میباید نہ ملبوس فرنگ

اندرین رہ جز نگہ مطلوب نیست
این کلہ یا آن کلہ مطلوب نیست
فکر چالاکی اگر داری بس است
طبع دراکی اگر داری بس است
گر کسی شبہا خورد دود چراغ
گیرد از علم و فن و حکمت سراغ
ملک معنی کس حد او را نبست
بی جہاد پیہمی ناید بدست
ترک از خود رفتہ و مست فرنگ
زہر نوشین خوردہ از دست فرنگ
زانکہ تریاق عراق از دست داد
من چہ گویم جز خدایش یار باد
بندۂ افرنگ از ذوق نمود
می برد از غربیان رقص و سرود
نقد جان خویش در بازد بہ لہو
علم دشوار است می سازد بہ لہو
از تن آسانی بگیرد سہل را
فطرت او در پذیرد سہل را
سہل را جستن درین دیر کہن
این دلیل آنکہ جان رفت از بدن

....

اقبالؒ کے کلام کی یہ تشریح ہی ہے کہ جب برنارڈ شا سے کسی نے پوچھا کہ اگر مسلمان سپین سے نہ نکالے جاتے تو کیا ہوتا۔ جواباً برنارڈ شا نے کہا کہ انسان چاند پر سو سال پہلے پہنچ جاتا۔

....

اقبالؒ نے اپنے روحانی سفر ''جاوید نامہ'' میں اپنے آپ کو جس نام سے پکارا، وہ تھا: ''زندہ رود''۔ اقبالؒ کے بیٹے جسٹس جاوید اقبال نے اقبالؒ پر جو کتاب لکھی ہے اس کا نام بھی ''زندہ رود'' ہی ہے۔ زندہ رود کا مطلب ہے کہ ایک ایسا چشمہ کہ جو ہر دور میں جاری رہے۔ اقبالؒ نے اپنے بارے میں یہی کہا ہے کہ میرا کلام، میری نگاہ، میری سوچ آنے والی نسلوں کو بھی سیراب کرتی رہے گی۔ لہذا اقبالؒ شناسی کا سفر جب بھی شروع کیا جائے بروقت ہے۔

شکوہ اور جواب شکوہ کے بعد اقبالؒ نے اپنی فارسی کی مثنویوں ''اسرار خودی'' اور ''رموز بیخودی'' پر کام کا آغاز کیا اور اگلے کئی سال تک ان کی تکمیل میں لگے رہے۔ فطرت کئی صدیوں سے جس لالے کی حنا بندی کر رہی تھی، اس کا پھل اور پھول اب ظاہر ہونے کو تھا......!

......☆......☆............☆......☆......

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زاده است
این گہر از دست ما افتاده است
چون عرب اندر اروپا پر گشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آن صحرا نشینان کاشتند
حاصلش افرنگیان برداشتند
این پری از شیشہ اسلاف ماست
باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

"Science was not brought into being by the West;
In essence it is nothing but the delight that lies in creation;

If you ponder well, it is the Muslims who gave it life;
It is a pearl we dropped from our hands.

When the Arabs spread over Europe,
They laid new foundations of learning and science.

The seed was sown by these dwellers of the desert;
But the harvest was reaped by the West.

This spirit is from the flask of our own ancestors;
Bring this fairy back, for she hails from our own Caucasus."

یعنی ''سائنس مغرب کی پیداوار نہیں ہے۔ اپنی اصل میں یہ اس جذبۂ تخلیق کا اظہار ہے جو کہ فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ اور اگر تم غور کرو تو یہ مسلمان ہی تھے کہ جنہوں نے سائنس کو زندہ کیا۔ یہ وہ گوہر تھا کہ جسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا۔ عربوں کے یورپ پر چھانے کے بعد علوم وفنون کو نئی بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ بیج تو ان صحرا نشینوں نے بویا تھا، مگر فصل کو کاٹا مغرب نے۔ اس جام میں موجودہ بادہ ہمارے آباء کا ہی ڈالا ہوا ہے۔ علوم وفنون کی اس گم گشتہ پری کو واپس بلاؤ کہ اس کا وطن یہی ہے۔''